© rasailojarаid.com

مقالات

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

قانونِ شہادت اور اسلام

شہادت کا مفہوم اور تعریف :

لغوی لحاظ سے شہادت کا معنی حاضر ہونا یا موجود ہونا بھی ہے اور کسی چیز کا مشاہدہ کرنا بھی، خواہ یہ مشاہدہ ظاہری آنکھ سے ہو یا بصیرت سے (مفردات) اور جب یہ لفظ ایک شرعی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ:

"وہ بات جو کامل علم و یقین سے کہی جائے، خواہ یہ علم و یقین مشاہدۂ بصر سے حاصل ہو یا بصیرت سے!" (مفردات، امام راغب)

لیکن امام موصوف کی یہ تعریف بھی شہادت کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی۔ کیونکہ شہادت یہ بھی ہے کہ کوئی بات یا بیان کسی عدالت یا قاضی کے رُوبرو دیا جائے، تاکہ کسی متنازعہ فیہ امر کو فیصل کرنے کے لیے یہ بیان ممد ثابت ہو۔

گویا شہادت کی بھی دو قسمیں ہوئیں ایک عینی شہادت، جسے انگریزی میں (WITNESS) کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ عموماً چشم دید گواہ کے لیے آتا ہے۔ اور دوسرے قلبی شہادت، جس میں عینی مشاہدہ ضروری نہیں ہوتا اور وہ بیان حاصل شدہ علم و یقین کی بنا پر دیا جاتا ہے۔ جیسے کلمۂ شہادت، جس کے ذریعہ کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اس قلبی شہادت کو انگریزی میں عموماً "EVIDENCE" کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ "WITNESS" سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ ابلغ اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی "WITNESS" کے معنوں میں بھی آجاتا ہے۔

شہادت کی اہمیت:

اثباتِ دعویٰ کے چار شرعی طریقوں میں سے ایک اہم طریقہ شہادت ہے۔ اور یہ چار طریقے بالترتیب درج ذیل ہیں:

۱۔ اقرار مدعا علیہ ۲۔ شہادات از طرف مدعی (۳) مدعا علیہ کے انکار کی صورت میں قسم اور ۴۔ قرائن۔

شہادت کی اہمیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں واضح فرمایا:

"لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَّاَمْوَالَهُمْ وَلٰكِنَّ الْبَيِّنَةَ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنَ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ"

کہ "اگر لوگوں کے دعوٰی ہی کی بنا پر ان کے مطالبات پورے کیے جائیں تو لوگ خون اور اموال کے بہت زیادہ مقدمات دائر کر دیں۔ لہٰذا شہادت یا بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور مدعا علیہ پر قسم ہے"

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُنْكِرِ"

جبکہ ایک تیسری روایت کے الفاظ یوں ہیں:

"وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ"

ان تینوں روایات کا مطلب ایک ہی ہے۔

ان روایات سے درج ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

(۱) باہمی حقوق کے جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے مدعی کے لیے شہادات مہیا کرنا ایک نہایت اہم ضرورت ہے۔

(۲) مدعی خواہ کتنا ہی متقی اور راست باز کیوں نہ ہو اور مدعا علیہ خواہ کیسا ہی فاسق و فاجر یا کافر ہو، صرف مدعی کے بیان پر اس کا دعوٰی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کی واضح مثال یہ واقعہ ہے، کہ جب حضرت علیؓ کی زرہ ان کے اپنے دورِ خلافت میں ایک یہودی نے چرا لی تو حضرت علیؓ جیسے راستباز اور خلیفۂ وقت کو بھی اپنا مقدمہ عدالت میں پیش کرنا پڑا اور یہودی کے مقابلہ میں اپنے دعوٰی کے اثبات کے لیے گواہ پیش کرنا پڑے۔

(۳) شہادت کی فراہمی ایک ذمہ داری ہے جو مدّعی پر ہے اور یہ ایک حق بھی ہے۔ اور یہ حق مدّعی کا ہی ہے، مدعا علیہ کا نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مدّعی دعوائے کرے تو مدعا علیہ اس کے برخلاف شہادات مہیا کر کے دعوائے خارج کرا دے۔

۴۔ البتہ قسم مدعا علیہ کا حق ہے۔

مقدمہ زیرِ نزاع کے اقدامات اس طرح ہوتے ہیں کہ مدّعی کے دعوٰی دائر کرنے پر:

(ا) اگر مدّعا علیہ اس کا اقرار کر لیتا ہے تو دعوٰی ثابت ہو گیا اور یہ اثبات دعوٰی کی سب سے بہتر صورت ہے۔

(ب) اگر مدعا علیہ اقرار نہیں کرتا تو پھر مدّعی کو شہادات فراہم کرنا ہوں گی۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے اور معتبر شہادات مہیا کر دے تو بھی مدّعی کا دعوٰی ثابت اور فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے گا۔

(ج) اگر مدعا علیہ اقرار بھی نہیں کرتا اور مدّعی معتبر شہادات فراہم کرنے سے قاصر رہا ہے تو پھر مدعا علیہ اپنے بیان پر قسم اٹھائے گا اور دعوائے خارج ہو جائے گا۔

(د) قطعِ نزاع کے لیے دورانِ مقدمہ قرائن سے مدد اور راہنمائی حاصل کرنا قاضی کا کام ہے۔

شہادت اور اقرار کا فرق:

اقرار بھی دراصل شہادت ہی کی ایک قسم ہے۔ اقرار اس شہادت کو کہتے ہیں جو مدّعا علیہ اپنے خلاف بیان دیتا ہے اور قرآن میں شہادت کا لفظ ان معنوں میں بھی آیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ" (الانعام: ۱۳۰)

"وہ (کافر قیامت کے دن) کہیں گے ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار[1] ہے۔ ان لوگوں کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا اور اب خود اپنے اوپر گواہی دی کہ وہ کفر کرتے رہے تھے۔"

(ترجمہ فتح محمد جالندھری)

اور دوسرے مقام پر ہے:

"يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۔ الآیۃ!

(النساء: ۱۳۵)

"اے ایمان والو، عدل و انصاف کے پابند رہو اور اللہ کے لیے گواہی دو خواہ وہ اپنے ہی خلاف کیوں نہ پڑے اور خواہ تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔"

شہادت اور اقرار میں دوسرا فرق یہ ہے کہ اقرار کا اثر صرف مُقر کی ذات تک محدود ہوتا ہے جبکہ گواہی دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت اس مثال سے سمجھئے کہ چند افراد پر قرض کا دعوٰی کیا گیا۔ اب ان میں سے ایک دو نے تو اس قرض کا اقرار کر لیا۔ مگر باقی افراد نے اقرار نہیں کیا۔ تو جن لوگوں نے اقرار کیا ہے ان کا اقرار اپنی ذات تک محدود رہے گا۔ لیکن جب مدعی اپنے دعوٰی کے ثبوت میں گواہ پیش کر دے تو اس کا اثر تمام مدعا علیہان پر یکساں ہو گا۔

اور تیسرا فرق یہ ہے کہ مُقر اگر حقوق العباد میں اقرار کرتا ہے تو اس اقرار سے پھر نہیں سکتا۔ لیکن حقوق اللہ میں اگر اقرار کے بعد انکار کر دے تو اس کا یہ انکا

---

[1] جس شخص کے حق میں شہادت دی جائے اسے "مشہود لہ" اور جس شخص کے خلاف دی جائے اسے "مشہود علیہ" کہتے ہیں۔ اور اگر یہ شہادت اپنے ہی خلاف ہو تو اسی کا نام "اقرار جرم" ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمہور علماء کے نزدیک معتبر ہے۔ اور اس سے حدِ شرعیہ ٹل جائے گی۔ کیونکہ انکار کے بعد کئی طرح کے شکوک و احتمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ جبکہ شہادت سے کوئی شاہد کسی صورت میں بھی منحرف نہیں ہو سکتا۔

گواہی دینے کا حکم:

کسی شخص کے جائز حق کو ثابت کرنے کے لیے عند الطلب گواہی دینا نہایت ضروری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا" (البقرۃ ۲۸۲)

"اور گواہوں کو جب طلب کیا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہیے"۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

"وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ" (البقرۃ: ۲۸۳)

"اور گواہی کو چھپاؤ نہیں۔ اور جو اسے چھپاتے تو اس کا دل گنہگار ہے"۔

شہادت کو چھپانا شہادت نہ دینے سے بھی بڑا گناہ ہے۔ جو شخص عدالت میں چلا تو جاتا ہے اور سب کچھ جاننے کے باوجود حقیقتِ حال کو ظاہر نہیں کرتا، وہ اس شخص سے زیادہ مجرم ہے جو نہ عدالت میں جاتا ہے اور نہ گواہی دیتا ہے وہ یہ نہ سمجھے کہ عدالت میں جا کر اگر اس نے سچ بات نہیں بتلائی تو کم از کم جھوٹ بھی تو نہیں بولا۔ حضرت اکرمؐ نے کتمانِ شہادت کو بھی جھوٹی شہادت کے برابر قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشادِ مبارک ہے:

"مَنْ كَتَمَ شَهَادَةً إِذَا دُعِيَ إِلَيْهِ كَانَ كَمَنْ شَهِدَ بِالزُّورِ" (بخاری کتاب الشہادات، باب ما قیل فی شہادۃ الزور)

"جس شخص نے گواہی کو اس وقت چھپایا، جب اسے گواہی دینے کے لیے کہا گیا، تو وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے جھوٹی گواہی دی"۔

جبکہ سچی گواہی کی ترغیب دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

"أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ[1]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قَبْلَ اَنْ یُّسْاَلَهَا“ (مسلم کتاب الاقضیۃ۔ باب بیان خیر الشهود)

”کیا میں تمہیں ایسے گواہ کی خبر نہ دوں جو سب سے زیادہ بہتر ہے؟ ایسا گواہ وُہ ہے جو طلب کرنے سے پہلے ہی گواہی دے دے“

مگر ایسی گواہی صرف اس شخص کے حق میں ہو جو کمزور ہو اور اس پر علانیہ ظلم ہوتا دیکھ رہا ہو۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایسی گواہی دینا، مشہود علیہ کو اپنا دشمن بنانے کے مترادف اور بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اسی لیے آپؐ نے ایسے گواہ کو ”خیر الشهداء“ کے لقب سے نوازا ہے۔

گواہی نہ دینے کا حکم:

حقوق العباد میں گواہی دینا بہتر ہے۔ جبکہ حقوق اللہ، جس میں کسی پر حد قائم ہونے کا خطرہ ہو، گواہی نہ دینا زیادہ بہتر ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

”مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ“

”جس نے کسی مسلمان (کے کسی جرم) پر پردہ ڈالا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس (کے جرائم) پر پردہ ڈالے گا“

اسی طرح کسی چوہدری قسم کے آدمی کی محض حمایت حاصل کرنے کے لیے اس کے کہنے پر اس کے حق میں گواہی دینا یا بن بلاتے ہی جاکر گواہی دینا سخت مذموم فعل ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

”مَنْ مَشٰى مَعَ قَوْمٍ لِيُرٰى اَنَّهٗ شَاهِدٌ وَّلَيْسَ بِشَاهِدٍ فَهُوَ كَشَاهِدِ الزُّوْرِ“ (فتح الربانی ج ۱۵ ص ۲۲۲)

”جو شخص کسی قوم کے ساتھ اس لیے چلتا ہے کہ لوگ اسے گواہ سمجھیں، حالانکہ وہ گواہ نہیں ہے۔ تو وُہ اس شخص کی مانند ہے جو جھوٹی گواہی دیتا ہے“

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

يَلُونَهُمْ ثُمَّ يَجِيءُ قَوْمٌ يُحِبُّونَ السَّمَانَةَ وَيُحِبُّونَ
الْمَآكِلَ وَالْمَشَارِبَ وَيَشْهَدُونَ قَبْلَ اَنْ يُّسْتَشْهَدُوا "
(بخاری کتاب الشہادات- باب لا یشهد علی شهادة)

" بہترین زمانہ میرا دور ہے، پھر صحابہؓ کا، پھر تابعینؒ کا- پھر اس کے بعد ایک ایسی قوم آئے گی جو موٹاپے کو پسند کرے گی- خورد و نوش کے دلدادہ ہوں گے اور گواہی طلب کیے بغیر وہ گواہی دیتے پھریں گے "

جھوٹی گواہی کا گناہ:

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جھوٹی گواہی دینے سے منع فرمایا ہے- ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

" وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ " (الفرقان ۷۲)

" اور وہ (مسلمان) جھوٹی گواہی نہیں دیتے "

شہادت کے سلسلہ میں اللہ نے کذب کی بجائے " زور " کا لفظ استعمال فرمایا، جو کذب سے بہت زیادہ ابلغ ہے- کذب یہ ہے کہ کوئی بات خلافِ واقعہ بیان کی جائے- اور " زور " میں یہ بات بھی شامل ہے کہ واقعہ کی نوعیت کو تو نہ بدلا جائے، لیکن اسے اس طرح توڑ موڑ کر یا اینچ پینچ ڈال کر بیان کر دیا جائے کہ اس سے مدعی یا مدعا علیہ کے حقوق متاثر ہوتے ہوں- بالفاظِ دیگر ہم اسے فریب و دجل کا جھوٹ یا بدترین جھوٹ کہہ سکتے ہیں-

حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خطاب میں فرمایا:

" لوگو سن لو! جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے "

پھر دلیل کے طور پر یہ آیت پڑھی:

" فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ "
(الحج : ۳۰)

(سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیۃ، باب فی شہادۃ الزور)

اور جھوٹے گواہ کی سزا کے متعلق آپؐ نے فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"لَنْ تَزَالَ قَدَمَا شَاهِدِ الزُّوْرِ حَتّٰى يُوْجِبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ" (بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر)

"قیامت کے دن جھوٹے گواہ کے قدم کہیں نہ ٹک سکیں گے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے دوزخ واجب کر دے گا۔"

آپ صلعم نے محض سنی سنائی بات کو آگے بیان کرنے سے بھی منع فرمادیا پھر اس طرح کی سنی سنائی بات کے مطابق عدالت میں گواہی دینا تو دور کی بات ہے، ارشادِ گرامی ہے:

"كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ" (مقدمہ صحیح مسلم ص ۸)

"کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بیان کر دے۔"

گواہی کی صحت کی شرائط:

گواہی کی صحت کے لیے کچھ شرائط ایجابی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ مسلمان ہو:

عہدِ نبوی میں ایک اعرابی کو، جس نے نیا چاند دیکھا تھا، گواہی دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا:

"اَتَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ؟"

"کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟"

اس اعرابی نے کہا "ہاں"۔ پھر آپ صلعم نے پوچھا:

"اَتَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ؟"

"کیا یہ بھی گواہی دیتے ہو کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں؟"

اعرابی نے کہا، "ہاں!" اس پر آپ صلعم نے اس کی گواہی قبول فرمائی۔ (نسائی۔ کتاب الصیام۔ باب شہادۃ رجل واحد)

اس شرط میں استثناء یہ ہے کہ اگر لین دین کے معاملات یعنی مالی مقدمات میں دو مسلمان گواہ میسر نہ آسکیں۔ جیسے حالتِ سفر میں کسی مسلمان کی موت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقت ـــــ تو غیر مسلموں کو بھی گوارا کیا جا سکتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ" (المائدة: ۱۰۶)

"اے ایمان والو، جب تم میں سے کوئی قریب مرگ ہو اور وصیت کرنا چاہے تو دو دیانتدار گواہ بنا لو جو تم میں سے (مسلمان) ہوں (اور اگر نہ مل سکیں) تو غیر مسلموں کو ہی گواہ بنا لو"

۲۔ عادل ہو: گواہ کا عادل ہونا بھی ضروری ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں بھی گواہی دینے کا ذکر آیا ہے تو ساتھ ہی عدل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر کی آیت سے بھی واضح ہے۔ ایک دوسرے مقام پر طلاق کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق: ۲)

"اور مسلمانوں میں سے دو صاحبِ عدل گواہ بنا لو"

صاحبِ عدل گواہ کو ہم اپنی زبان میں معتبر گواہ کہتے ہیں۔ یعنی ایسا بالغ شخص جس کے حواسِ خمسہ اور بالخصوص قوتِ مشاہدہ ٹھیک ٹھاک ہو۔ قوتِ بیان بھی درست ہو۔ قوتِ حافظہ بھی رکھتا ہو۔ اور بحیثیتِ راست باز ہونے کے اچھی شہرت رکھتا ہو۔ بالفاظِ دیگر عادل میں دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) ثقاہت (۲) حفظ وضبط۔

ان ایجابی شرائط کے علاوہ سلبی شرائط درج ذیل ہیں:

۳ تا ۵ ـــــ بچہ، مجنون یا مجبور نہ ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

"رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ الصَّبِیُّ وَالْمَجْنُوْنُ وَالْمُكْرَهُ"

(بخاری، کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق والمکرہ والسکران والمجنون)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"تین قسم کے لوگوں کی بات کا اعتبار نہیں (۱) بچہ یعنی نابالغ (۲) مجنون یا پاگل (۳) اور مجبور شخص"

لہٰذا پابندِ سلاسل مجرم کا اقرار یا شہادت معتبر قرار نہیں دی جا سکتی۔ جیسے کہ پولیس کی مار دھاڑ کے ڈر سے ملزم کا اقرار یا شہادت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

۶۔ قاذف:

قاذف (زنا کی تہمت لگانے، پھر اسے ثابت نہ کر سکنے والے) کی گواہی مردود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا" (النور: ۴)

"اور جو لوگ پرہیز گار عورتوں پر بدکاری کا عیب لگائیں، پھر اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی درّے مارو اور آئندہ کبھی ان کی شہادت مت قبول کرو۔"

۷۔ جس گواہ کی کوئی پہلی گواہی عدالت میں جھوٹی ثابت ہو چکی ہو، اس کی گواہی بھی آئندہ کے لیے مردود قرار پائے گی۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے:

"أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَدَّ شَهَادَةَ رَجُلٍ فِي كَذِبَةٍ كَذَبَهَا" (القضاء لابی عبید)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی گواہی کو مردود قرار دیا جو پہلے کسی معاملہ میں جھوٹی گواہی دے چکا تھا۔"

۸ تا ۱۰۔ زانی اور زانیہ، خائن اور خائنہ نیز ایسا شخص جس کی مشہود علیہ کے ساتھ کوئی سابقہ پرخاش یا دشمنی ہو تو ایسے تینوں اشخاص کی شہادت بھی مردود قرار پائے گی۔ ارشادِ نبوی ہے:

"لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ وَلَا زَانٍ وَلَا زَانِيَةٍ وَلَا ذِي غِمْرٍ عَلَى أَخِيهِ" (ترمذی، ابواب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الشہادات۔ باب ماجاء فیمن لا تجوز شہادتہ)

"خائن، خائنہ۔ زانی، زانیہ اور اس شخص کی بھی شہادت قبول نہیں جو اپنے بھائی (مشہود علیہ) سے دشمنی رکھتا ہو۔"

۱۱۔ جائے واردات یا وقوعہ سے کسی دور رہنے والے شخص کی شہادت بھی قابلِ قبول نہیں۔ کیونکہ اس میں زیادہ احتمال شنید کا ہوتا ہے۔ مشاہدہ کا نہیں ہوتا۔ ارشادِ نبوی ہے:

"لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ بَدَوِيٍّ عَلَى صَاحِبِ قَرْيَةٍ"

"کسی دیہاتی کی کسی شہری کے حق میں گواہی قبول نہیں۔"

(ابوداؤد مع عون ج ۳ ص ۳۳۶)

۱۲ تا ۱۵۔ دو ایسے افراد جن میں ایک سے، دوسرے کی تربیت کا تعلق ہو، انکی بھی ایک دوسرے کے حق میں گواہی ناقابلِ قبول ہے۔ مثلاً:

۱۲۔ باپ کی بیٹے کے حق میں اور اس کے برعکس
۱۳۔ عورت کی شوہر کے حق میں 〃 〃 〃
۱۴۔ غلام کی آقا کے حق میں 〃 〃 〃
۱۵۔ مزدور کی مالک کے حق میں 〃 〃 〃

ایسی سب شہادات ایک دوسرے کے حق میں ناقابلِ قبول ہیں۔

(السنن الکبریٰ بیہقی مطبوعہ حیدر آباد دکن ج ۱۰)

چنانچہ ایک یہودی نے حضرت علی رضؓ کی زرہ چوری کی تو آپؓ کو معلوم ہوگیا اور آپؓ نے قاضی شریح کی عدالت میں اس یہودی کے خلاف مقدمہ دائر کردیا۔ ساتھ ہی اپنے دعویٰ کے ثبوت میں حضرت حسنؓ اور اپنے ایک غلام کو بطورِ گواہ پیش کیا، تو قاضی شریح نے ان دونوں گواہیوں کو مسترد قرار دے کر مقدمہ خارج کردیا۔

(اس ایسے مثالی قسم کے عدل و انصاف کو دیکھ کر یہودی نے ازخود زرہ حضرت علی رضؓ کو واپس کردی اور مسلمان بھی ہوگیا)

مندرجہ بالا شرائط تو وہ ہیں جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں۔ پھر انہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیات و روایات سے استنباط کر کے فقہاء نے چند مزید شرائط کا اضافہ کیا ہے۔ مثلاً:

۱۶۔ مرتد کی گواہی۔ خواہ وہ اعتقاداً مرتد ہو یا عملاً۔ کیونکہ مرتد مسلمان نہیں، بلکہ منافق اور بدترین قسم کا کافر ہوتا ہے۔

۱۷۔ فاسق، تارکِ صلوٰۃ، سود خوار اور کبائر کے مرتکب کی گواہی بھی مردود ہے۔ (قدوری، کتاب الشہادات۔ نور الہدایہ ج ۳ ص ۳۷)

۱۸۔ کسی ذاتی منفعت کی بناء پر گواہی دینے والے کی گواہی بھی مردود ہے۔

۱۹۔ عادی یا پیشہ ور گواہ کی گواہی بھی ناقابلِ قبول ہے۔

مندرجہ بالا قسم کے گواہوں کی گواہی عدالت مجاز تسلیم کرنے کی پابند نہیں ہے، لیکن جب ایسے گواہ میسر نہ آئیں اور کسی حقدار کا علانیہ حق غصب ہو رہا ہو تو قاضی اپنی صوابدید کے مطابق اضطراری طور پر گواہی قبول کر سکتا ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر (مثلاً) زنا کا جرم شہادتوں کے ذریعہ ثابت ہونا تقریباً ناممکن ہے تو شریعت نے ایسی شہادتوں کو مقرر کیوں کیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے جہاں احکاماتِ حجاب اور بعض دوسرے احکام کے ذریعہ فحاشی اور زنا کے تمام دروازوں کا سدِّ باب کیا ہے، وہاں یہ آئینی شہادتیں اور ان شہادتوں پر ایسی کڑی پابندیاں بھی اثباتِ جرم کے لیے نہیں بلکہ فحاشی کے سدِّ باب کے لیے مقرر کی ہیں۔ چنانچہ سورۂ نور میں جہاں ان گواہیوں کا ذکر ہے، وہاں اس کی وجہ بھی بیان کر دی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (النور: ۱۹)

"جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت، بدکاری کی خبر) پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دردناک عذاب ہو گا اور اللہ وہ کچھ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے۔"

غور فرمائیے کہ اگر زنا کی شہادت کا نصاب بھی ۲ گواہیاں ہوتا اور ان گواہیوں پر ایسی کڑی پابندیاں بھی نہ ہوتیں تو کس قدر مقدمات عدالتوں تک پہنچ جاتے۔ فحاشی کے تذکرے نجی سطح سے نکل کر سرکاری سطح تک پہنچتے۔ ان پر گرما گرم بحثیں ہوتیں اور لوگوں میں ایسی فحاشی کے تذکروں کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا ہو جاتا جو مزید فحاشی پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ بن جاتا۔ لہٰذا شریعت کا منشاء یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ ایسی فحاشی دیکھے، یا اس کے علم میں آئے تو وہیں اس پر مٹی ڈال دے اور بات کو آگے نہ چلائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان، کہ:

"مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ"

(بخاری کتاب الادب باب من ستر المسلم ...)

"جس نے کسی مسلمان کے جرم پر پردہ ڈالا تو اللہ تعالیٰ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے جرائم پر پردہ ڈال دے گا!"

ایسے ہی مواقع کے لیے ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر شہادت سے مقصود ثبوتِ زنا نہیں۔ اور گواہی دینے کے بجائے اس کو چھپانا بہتر ہے تو اس طرح معاشرہ کو کھلا چھوڑ دینے پر معاشرہ میں فحاشی نہ پھیلے گی؟ تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ:

۱۔ اگر کچھ باتیں یا افواہیں نجی سطح پر لوگوں میں پھیل بھی جائیں تو کچھ عرصہ بعد از خود نسیًا منسیًا ہو جاتی ہیں۔ لیکن جو باتیں سرکاری سطح پر عدالتی ریکارڈ میں آجائیں وُہ بقائے دوام کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ اور یہ شریعت کا منشاء ہرگز نہیں۔

۲۔ شریعت کا منشاء یہ بھی نہیں کہ شہادت میں نرمی اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا جرم ثابت کیا جائے اور ایسی شدید ترین سزائیں دی جائیں۔

۳۔ اقرار اور قرائن ایسے ذرائع موجود ہیں، جن کے ذریعہ معاشرہ کو اس شدید جرم کی شدید سزا سے متنبہ رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً حمل کسی کنواری کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زنا کے لیے واضح قرینہ ہے۔ پھر اسی زانیہ سے زانی کا پتہ چل سکتا ہے۔
شادی شدہ ہونے کی صورت میں مرد کی طرف سے دعویٰ اور عورت کا حمل پورا ثبوت مہیا کر دیتے ہیں۔ اور آج کل زنا کے قرائن کی بہت سی ایسی چیزیں ایجاد ہو چکی ہیں جن سے زنا کا واضح ثبوت مہیا ہو جاتا ہے۔

۴۔ اقرار اور قرائن کا فائدہ یہ ہے کہ ان سے اثباتِ جرم تو ہو جاتا ہے، لیکن شہادتوں کی نسبت سے فحاشی بہت کم پھیلتی ہے۔ اب جتنے جرائم کا اقرار و قرائن سے پتہ چل سکتا ہے، اس سے زیادہ کا پتا چلانا اور انہیں سزا دینا شریعت کا مقصود ہی نہیں۔

نصابِ شہادت

۱۔ چار مردوں کی گواہی :

چار شہادتوں کی ضرورت صرف زنا کے معاملہ میں پیش آتی ہے۔ (سورۃ نور ۲۴)
زنا کی سزا چونکہ شدید ترین ہے اس لیے اس کی شہادت میں احتیاط بھی سب سے زیادہ ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس معاملہ میں صرف عینی شہادت ہی قبول کی جا سکتی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ گواہ نے کسی عورت اور مرد کو محض ایک بستر میں ہی نہ دیکھا ہو بلکہ فی الواقع جماع کرتے دیکھا ہو۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی چار شہادات کا میسر آنا انتہائی مشکل ہے۔ لہٰذا دورِ نبویؐ میں صرف اقرارِ جرم کی بنیاد پر ہی زنا کی حد جاری کی جاتی رہی ہے۔ یا پھر اس سلسلہ میں قرائن سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی کنواری کو حمل ہو جانا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اس نے زنا کیا ہے۔

جرمِ زنا کے گواہیوں کی بناء پر ثابت نہ ہو سکنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ زنا کے گواہ خود بھی دراصل گواہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مجرم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر ان چار گواہوں کے بیانات میں معمولی سا بھی تضاد واقع ہو جائے یا ثبوتِ جرم میں ذرا سا بھی اشتباہ پیدا ہو جائے تو یہ گواہ خود قذف کے مجرم قرار پائیں گے۔ اصل ملزمان تو سزا سے

© rasailojaraid.com

بچ جائیں گے لیکن ان گواہوں کو ضرور سزا مل جائے گی۔ کیونکہ ان کا الزام عدالت میں ثابت ہو گیا۔ ان دو وجوہ کی بناء پر زنا کا جرم شہادات کے ذریعہ ثابت ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ اقرار اور قرائن ہی اس جرم کو ثابت کر سکتے ہیں۔

۲۔ تین مردوں کی گواہی:

افلاس کو ثابت کرنے اور اس بنا پر لوگوں سے سوال کے جواز کے لیے تین گواہوں کی ضرورت ہے حضرت قبیصہؓ بن مخارق اپنا واقعہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میں نے حمالہ (کسی دوسرے شخص کے قرضہ کی ضمانت) اٹھایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"اے قبیصہ، یہاں ٹھہرو۔ صدقہ کا مال آئے گا تو ہم تجھے دیں گے"۔

پھر آپؐ نے فرمایا:

"اے قبیصہ، تین شخصوں کے علاوہ کسی کو سوال کرنا جائز نہیں۔ ایک وہ شخص جس پر قرضے یا ضمانت کا بوجھ پڑ گیا ہو، اور وہ اس کی ادائیگی سے معذور ہو (جیسا کہ خود حضرت قبیصہؓ کا معاملہ تھا) وہ مانگ لے تا آنکہ اس کی رقم پوری ہو جائے، پھر رک جائے!

دوسرا وہ شخص کہ ناگہانی آفت سے اس کا مال یا کھیتی ضائع ہو گئی اور وہ محتاج ہو گیا۔ وہ اس حد تک سوال کر سکتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

تیسرے وہ فاقہ زدہ آدمی جس کے متعلق اس کی قوم کے تین معتبر آدمی اس کی فاقہ زدگی پر شہادت دیں، تو اسے سوال کرنا حلال ہے"۔

(نسائی۔ کتاب الزکوٰۃ)

دو مردوں کی گواہی:

زنا کے علاوہ بقیہ حدود مثلاً قصاص، چوری، قذف وغیرہ میں دو مردوں کی گواہی شرط ہے۔ طلاق کے معاملہ میں دو مردوں کی گواہی ضروری ہے (الطلاق: ۲) نکاح میں کم از کم دو مرد ہو سکتے ہیں۔ جتنے زیادہ ہو سکیں بہتر ہے۔

© rasailojaraid.com

۴۔ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی :

مالی مقدمات مثلاً خرید و فروخت، قرضہ، لین دین، وراثت، وصیت اور غصب وغیرہ کے معاملات میں دو مرد مل جائیں تو بہتر ہے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے بھی کام چل سکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

" وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ " (البقرۃ : ۲۸۲)

اور (قرضہ کی تحریر کے وقت) اپنے (مسلمان) مردوں میں سے دو گواہ بنا لیا کرو۔ اور اگر وہ میسر نہ آ سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جنہیں تم بطورِ گواہ پسند کرو (یعنی وہ عادل ہوں)"

آیتِ بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

۱۔ بہتر صورت یہی ہے کہ مالی مقدمات کے گواہ بھی دو مرد ہی ہوں۔ کیونکہ عدالتوں میں جا کر گواہی دینا عورت کے دائرہ کار سے خارج ہے۔ ہاں اگر دو عادل مسلمان مرد میسر نہ آئیں تو اضطراری صورت میں عورت کو بھی اس میدان میں لایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اضطراری صورت میں اگر مسلمان میسر نہ آئیں تو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنایا جا سکتا ہے۔ (المائدۃ ۱۰۶)

۲۔ "دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے" اور "ایک عورت کی گواہی ایک مرد کی نصف شہادت کے مثل ہے" (بخاری، مسلم)

۳۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اگر دو مسلمان مرد میسر نہ ہوں تو چار عورتوں کی گواہی سے کام چلا لیا جائے۔ بلکہ اس کی وہی عین و مقرر صورت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دی۔

۵۔ صرف ایک مرد کی گواہی :

صرف ایک مرد کی گواہی درج ذیل امور میں کافی ہے :

۱۔ رؤیتِ ہلال : جیسا کہ ہم مسلمان ہونے کی شرط کے تحت ایک اعرابی کے واقعہ سے متعلق حدیث درج کر چکے ہیں۔ (نسائی، کتاب الصیام، بابُ شَهَادَةِ رَجُلٍ وَاحِدٍ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ **اموالِ سلب**: کے اثبات کے لیے بھی ایک گواہی کافی ہے۔ غزوۂ حنین کے موقعہ پر آپؐ نے فرمایا:

"مَنْ لَهُ بَيِّنَةٌ عَلٰى قَتِيْلٍ قَتَلَهُ فَلَهُ سَلَبُهُ"

(بخاری، کتاب الاحکام باب الشهادة تكون عند الحاكم)

"جس مسلمان نے کسی کافر کو قتل کیا ہو اس کا سامان اسی مسلمان کو دیا جائے گا، بشرطیکہ اس کے پاس کوئی گواہ ہو۔"

چنانچہ ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ "میں نے ایک مشرک کو قتل کیا اور آپؐ کے اس اعلان پر پکارا کہ "کون میرے لیے گواہی دے گا؟" لیکن کوئی شخص نہ بولا۔ میں نے دوبارہ اور سہ بارہ یہی بات دہرائی مگر کوئی نہ بولا۔ حضور اکرمؐ نے پوچھا، "ابوقتادہ، کیا بات ہے؟" میں نے عرض کی، "میں نے بھی ایک مشرک کو قتل کیا ہے۔" اتنے میں ایک آدمی نے کہا، "ابوقتادہ سچ کہتا ہے، اور اس کے مقتول کا سامان میرے پاس ہے۔ آپؐ یہ مال میرے پاس رہنے دیں اور اسے اپنے پاس سے دے دیں۔" آپؐ نے فرمایا، "نہیں۔ یہ سلب شدہ مال ابوقتادہ کو ملے گا۔" پھر آپؐ نے وہ مال مجھے دلوا دیا۔"

۳۔ **ثبوتِ رضاعت**: کے لیے بھی ایک گواہ کافی ہے۔ اور اس میں عورت مرد دونوں کی حیثیت برابر ہے (بخاری۔ کتاب النکاح باب شهادة المرضعة) کیونکہ یہ معاملہ عورتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے پوچھا کہ "ثبوتِ رضاعت کے لیے کتنے گواہ درکار ہیں؟" آپؐ نے فرمایا:

"رَجُلٌ اَوِ امْرَاَةٌ"

یعنی ایک مرد یا ایک عورت کی گواہی کافی ہے۔"

۴۔ **عورت کی طرف سے طلاق کا دعویٰ**: اگر عورت یہ دعویٰ کرے کہ اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہے اور وہ ایک عادل گواہ بھی پیش کر دے، تو ثبوت مکمل ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود شریعت نے طلاق کو چونکہ "اَبْغَضُ الْحَلَالِ" قرار دیا ہے لہٰذا مدعا علیہ یعنی شوہر سے قسم لی جائے گی۔ اگر وہ کہہ دے کہ میں نے عورت کو طلاق نہیں دی تو گواہی غیر مؤثر ہو جائے گی۔ اور طلاق واقع نہ ہوگی (زاد المعاد لابن القیم)

۵۔ شاگردوں کے معاملات میں صرف معلم کی گواہی کافی ہے (الاشباہ والنظائر لابن القیم ص ۵۱)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گو یہ گواہی ایک ہے مگر مشروط ہے۔

۶۔ جرح و تعدیل: گواہوں کی جرح و تعدیل اور عادل ہونے میں بھی صرف ایک گواہی کافی ہے۔ (الاشباہ والنظائر لابن القیم ص ۲۸۱)

مقدمہ میں گواہوں پر مدعا علیہ اور اس کا وکیل جرح کر سکتے ہیں۔ اور مدعی یا اس کا وکیل ان کی تعدیل کر سکتا ہے۔ جب کہ قاضی کو ہر طرح سے جرح و تعدیل کے پورے اختیارات ہوتے ہیں۔

۷۔ وکیل کو معزول کرنے کی خبر اگر ایک آدمی دیتا ہے۔ تو وکیل معزول سمجھا جائے گا (ایضاً)

۸۔ ثبوتِ نقصان کے لیے بھی ایک گواہی کافی ہے۔ (ایضاً)

عورت کی گواہی:

مقدمات و معاملات عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں۔ جن میں عورت کی گواہی کی حیثیت درج ذیل ہے۔

حدود: حدود اللہ یعنی قصاص، زنا، چوری، ڈاکہ، قذف اور شراب وغیرہ میں عورت کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ امام زہری (م ۱۲۴ھ) جنہوں نے سب سے پہلے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے حدیث کی تدوین فرمائی، کہتے ہیں:

"جَرَتِ السُّنَّةُ مِنْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ لَا تُقْبَلَ شَهَادَةُ النِّسَاءِ فِي الْحُدُوْدِ" (المصنف لابن ابی شیبہ)

"عہدِ نبوی سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی جاتی۔"

۲۔ لین دین کے معاملات: لین دین کے معاملات میں اضطراری صورت میں عورت کی گواہی کو گوارا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی گواہی کی حیثیت مرد کی گواہی سے نصف ہے۔

۳۔ عورتوں سے متعلقہ مسائل: مثلاً رضاعت اور بچہ کی پیدائش وغیرہ، ایسے معاملات میں عورت کی گواہی معتبر اور مکمل ہوتی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں صرف ایک دائی کی گواہی کو جائز قرار دیا اسی طرح رضاعت کے ثبوت کے لیے صرف ایک عورت کی شہادت کو تسلیم کیا (بخاری کتاب النکاح باب شہادۃ المرضعۃ)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عدالتوں کی طرف سے عورتوں کو گواہی کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلایا جانا اور عورتوں کا عدالت میں جا کر گواہیاں دیتے پھرنا عورت کے احترام کے منافی اور شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے۔ اور ایسی باتیں عورت کے دائرہ کار سے خارج ہیں۔ البتہ جو معاملات عورتوں سے ہی متعلق ہیں، ان میں ان کی گواہی کی ضرورت بھی ہے۔ اور ایسی گواہی کو معتبر اور مکمل بھی سمجھا گیا ہے۔

شہادت سے متعلق چند مسائلِ جدیدہ

۱۔ گواہوں کا علیحدہ علیحدہ بیان:

عہدِ نبوی میں شہادت کا طریقہ نہایت سادہ تھا۔ مدعی، مدعا علیہ اور گواہ سب مسجدِ نبوی میں آپؐ کے سامنے بیان دیتے اور جو کچھ وہ بیان کرتے، اس کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا۔ یہ تصور نسبتاً بہت کم تھا کہ گواہ جھوٹ بول کر مقدمہ کا فیصلہ غلط بھی کروا سکتے ہیں۔ گواہ بھی عموماً چونکہ جھوٹ نہ بولتے تھے لہٰذا گواہوں پر جرح کا طریقہ بھی رائج نہ تھا۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں گواہوں کو علیحدہ علیحدہ بلانے اور بیان لینے کا رواج پڑا نیز جرح کی ابتداء ہوئی۔ خود حضرت علیؓ نے چند مقدمات میں گواہوں کو علیحدہ علیحدہ بلا کر گواہی لی۔ جس سے آپؓ کو حقیقتِ حال کا علم ہو گیا (الطرق الحکمیۃ لابن القیم ص ۴۸)

۲۔ مدعی اور گواہوں سے قسم:

اسی طرح دورِ نبوی میں مدعی اور گواہوں سے قسم لینے کا بھی رواج نہ تھا۔ نہ ہی آپؐ نے کوئی ایسا حکم فرمایا تھا۔ تاہم اس سے منع بھی نہیں فرمایا۔ لہٰذا اگر قاضی ایسی ضرورت سمجھے تو عند الضرورت اس کی اجازت ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اگر دو غیر مسلم گواہ، حالتِ سفر میں کسی مسلمان کے مرنے کی خبر اور اس کی وصیت پر گواہی دیں تو ایسے گواہوں کے لیے قرآن مجید نے قسم کی ہدایت فرمائی ہے (المائدۃ ۱۰۶-۱۰۷) اور حضورؐ نے اس کے مطابق فیصلہ بھی فرمایا۔

مدعی اور گواہوں سے باقاعدہ قسم لینے کی ابتداء قاضی شریح نے ہی کی تھی۔ لوگوں نے ان پر اعتراض بھی کیا کہ تم نے مدعی سے قسم لے کر بدعت کا آغاز کیا ہے۔ جس کے جواب میں انہوں نے کہا: "جب لوگوں نے بدعت پیدا کر لی۔ تو میں نے بھی بدعت کو پیدا کیا۔"

(الطرق الحکمیہ لابن القیم ص ۱۲۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ شہادت پر وکلاء کی اثر اندازی :

عہدِ نبوی میں مدعی خود اپنا دعویٰ پیش کرتا تھا اور مدعا علیہ بھی خود اس کا جواب دیتا تھا۔ وکیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تاہم معذوری کی حالت میں اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۔ (البقرۃ : ۲۸۲)

"اگر قرض لینے والا بے عقل یا کمزور ہو اور ادائے بیان کی اہلیت نہ رکھتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ بیان لکھوائے گا"

مگر وکالت کی موجودہ شکل جس میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے لیے وکیل کرنا ضروری ہے، قطعاً درست نہیں آج وکالت نے ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ جس کے نقصانات اس کے فوائد سے بہت بڑھ گئے ہیں۔ وکیل صاحبان یہ جاننے کے باوجود کہ ان کے مؤکل کا موقف سراسر غلط ہے، محض پیسے بٹورنے کی خاطر اسے سبز باغ دکھا کر مقدمہ میں الجھا دیتے ہیں۔ جھوٹی گواہیاں پیدا کرنے کی ترغیب، گواہوں کو غلط بیانات سکھلانا، جھوٹی قسمیں کھانا اور دلوانا ان کا روزمرہ کا معمول ہے۔ قانونی موشگافیوں کے ذریعہ واقعات میں اشتباہ پیدا کر کے صحیح مجرم کو سزا سے بچانا ان کی انتہائی کامیابی ہوتی ہے۔ ان کا اصل مقصد ہر جائز و ناجائز ذریعہ کو عمل میں لا کر مقدمہ جیتنا ہوتا ہے۔ اور وہ اس بات سے بے نیاز ہوتے ہیں کہ ان کے اس طرزِ عمل سے فریق مخالف پر کس قدر ظلم اور زیادتی ہو رہی ہے، ایسی صورتوں میں یہ پیشہ حرام اور اس کی کمائی بھی حرام ہو جاتی ہے۔ مقدمات میں روز افزوں اضافہ کی ایک بڑی وجہ یہی وکلاء کی فوج ظفر موج کا وجود ہے۔ پھر ان کی بھاری فیسوں نے حصولِ انصاف کو گراں تر بنا دیا ہے۔

سعودی عرب، جہاں آج کل حدودِ شرعیہ نافذ ہیں، میں آج بھی مقدمات وکلاء کی پیروی کے بغیر فیصل ہوتے ہیں، گواہ بھی وہی کچھ بیان دیتے ہیں جس کا انہیں علم ہوتا ہے۔ اور یہی وہ سیدھا اور سادہ طریق ہے، جو اسلام نے ہمیں سکھلایا ہے۔

محدث کے اس شمارہ کی قیمت ۶ روپے ہے، قارئین کرام اور ایجنسی ہولڈر نوٹ فرمالیں!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہادت اور قرائن:

شہادت اور قرائن کا بھی آپس میں گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا قرائن پر ضمنی بحث بھی ضروری ہے۔ اثباتِ دعویٰ کے سلسلہ میں قرائن بعض دفعہ تو شہادت کی گمشدہ کڑیوں کو ملاتے ہیں بعض دفعہ شہادت کا قائم مقام بن جاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ اقرار سے بھی زیادہ ثبوتِ دعویٰ مہیا کر دیتے ہیں۔ اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام پر زلیخا نے بدکاری کا الزام لگایا تو زلیخا کے گھر کے افراد میں سے ایک شاہد نے شہادت دی کہ "اگر یوسفؑ کی قمیض آگے سے پھٹی ہے تو یوسفؑ (معاذ اللہ) جھوٹے اور زلیخا سچی ہے اور اگر قمیض پیچھے سے پھٹی ہے تو یوسفؑ سچے اور زلیخا جھوٹی ہے۔"

اب دیکھئے کہ شاہد نے جو شہادت دی، وہ شہادت کی تعریف پر پوری نہیں اترتی بلکہ وہ ایک قرینہ ہے۔ اور اس قرینہ کو قرآنِ مجید نے درست ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کے لیے شہادت کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

۲۔ شرابی کے منہ سے اگر شراب کی بُو بھی آ رہی ہو اور وہ نشہ سے متوالا بھی ہو تو کسی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہ قرینہ شہادتوں کے قائم مقام بن جاتا ہے۔

۳۔ اگر چور سے چوری کا مال برآمد ہو جائے تو وہ اس کے اقرار سے بھی زیادہ مؤثر ثبوت ہو جاتا ہے اور یہ تو ہم بتلا چکے ہیں کہ ثبوتِ جرم کے سلسلہ میں شہادتوں سے اقرار زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

۴۔ بعض دفعہ اس عالمِ محسوس میں کوئی قرینہ سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ قاضی اپنی فہم و فراست کے ذریعہ اس معنوی قرینہ تک پہنچتا ہے۔

اس کی مثال داؤدؑ کی عدالت میں پیش آمدہ وہ مقدمہ ہے جس میں ایک عورت نے کسی دوسری عورت کے بچہ کے متعلق یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ بچہ میرا ہے۔ اب دونوں عورتیں یہ کہتی تھیں کہ یہ بچہ اس کا ہے۔ دونوں عورتیں مدعیہ بھی تھیں اور مدعا علیہا بھی اور ثبوت کسی کے پاس بھی نہ تھا۔ حضرت داؤدؑ نے فیصلہ کیا کہ ایک تیز چھری سے بچہ کے دو برابر ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اور ہر ایک مدعا علیہا کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا جائے۔ یہ فیصلہ سن کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جھوٹی مدعلیہا تو خاموش رہی مگر حقیقی والدہ فوراً پکار اٹھی کہ "بچے کے ٹکڑے نہ کئے جائیں یہ لڑکا اس دوسری عورت کا ہے اور میں اپنے دعوی سے دستبردار ہوتی ہوں"۔ یہ پکار سن کر حضرت داؤد سمجھ گئے کہ یہ پکارنے والی عورت ہی حقیقی والدہ ہو سکتی ہے لہٰذا بچہ اس حقیقی والدہ کے حوالے کر دیا ——————— (بخاری کتاب الفرائض باب اذا ادعت المرأۃ کذبا)

اب دیکھئے اس مقدمہ میں حضرت داؤد نے ایک ناقابلِ تردید فطری حقیقت "ماں کی ممتا" کے اصول کے تحت فیصلہ کیا، جسے اللہ تعالیٰ نے درست فرمایا۔ حالانکہ ظاہر میں کوئی قرینہ موجود نہ تھا۔ نہ شہادت تھی۔ اس مقدمہ کا فیصلہ انتہائی مشکل بات تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود بعض دفعہ بہت سے قرائن مل کر مکمل ثبوت مہیا نہیں کرتے اور شک وشبہ کا گمان رہتا ہے۔ اور شک وشبہ کی بناء پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شہادتوں کی ضرورت باقی رہتی ہے تاہم شک وشبہ تو شہادتوں کی صورت میں بھی باقی رہ سکتا ہے اور غلط یا جھوٹی شہادتوں کی بناء پر فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں غلط کا بار، یا گناہ قاضی پر نہیں رہتا۔ بلکہ مدعی یا گواہوں پر جا پڑتا ہے۔ قرائن کی بناء پر فیصلہ نہ کر پانے کی مثال یہ ہے کہ مدینہ میں ایک بدکار عورت رہتی تھی۔ قرائن پوری طرح شہادت دے رہے تھے کہ وہ بدکار ہے لیکن اس کے باوجود آپؐ نے فرمایا :

"اگر میں بغیر گواہوں کے کسی کو رجم کر سکتا تو میں فلاں عورت کو ضرور رجم کر دیتا، کیونکہ اس کی باتوں، اس کی ہیئت اور وہ لوگ جو اس کے پاس آتے جاتے ہیں، ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زانیہ ہے"۔

(بخاری۔ کتاب المحاربین۔ باب ما جاء فی التعریض)

۱۔ بعض دفعہ قرائن خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں، یہ مکمل ثبوت بہم نہیں پہنچاتے۔

۲۔ قرائن میں شک وشبہ کی بناء پر قاضی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ جب کہ شہادات کی صورت میں وہ شہادات کا پابند ہوتا ہے۔ اور اسی کے مطابق اسے فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی شک وشبہ کی گنجائش موجود ہے۔ اس لحاظ سے شہادات، قرائن سے زیادہ معتبر قرار پاتی ہیں۔

۳۔ قاضی کا ذاتی علم فیصلہ کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ وہ بہرحال شہادات کی بنیاد پر فیصلہ کا پابند ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com